حکیم الامت
حضرت مولانا تھانوی
نور اللہ مرقدہ

از

جناب احسان الحق قریشی صاحب

(برادر علامہ ڈاکٹر خالد محمود رحمہ اللہ)

ماہنامہ دار العلوم دیوبند

مارچ، اپریل 1954ء

حکیم الامّت حضرت مولٰنا تھانوی نور اللہ مرقدہٗ

(جناب احسان الحق قریشی ڈی، کام (لنڈن) انچارج کمرشل سنٹر سیالکوٹ)

"حضرت مولٰنا تھانوی کا نام آتے ہی تصوّر میں علم و فضل، دین و دیانت اور حکمت و بصیرت کا ایک دریائے ناپید اکنار موجزن ہو گیا۔ ہر انسانی زندگی کے فرائض و کمالات کے مختلف گوشے ہوتے ہیں، اور جن انسانوں کو فیضان ایزدی سے اچھی صلاحیتیں ملتی ہیں وہ ان سب گوشوں میں اپنے نمایاں اور ممتاز کردار کا ثبوت دیتے ہیں، مولٰنا کی زندگی میں بھی علم و عمل کے مختلف کمالات جمع تھے مگر اُن کی یہ خصوصیت تو بہت عرصہ تک یاد رہے گی کہ انہیں انسانی سیرت کی تعمیر اور تزکیہ و تخلیۂ باطن کا ایک قدرتی سلیقہ حاصل تھا حضرت مولٰنا نے صرف اپنے قلم سے ہی نہیں بلکہ اپنے عمل سے بھی شریعت و طریقت کی بقا و جلا اور صفا کے لئے بڑی خدمت انجام دی، مولٰنا تنہا اپنی ذات گرامی سے جتنا کام کر گئے اب ممکن نہیں کہ کوئی انجمن، ادارہ یا جماعت بھی اتنا کام کر سکے۔

ذیل میں انگریزی تعلیم یافتہ مگر دینی ذوق رکھنے والے ایک صاحب کا مضمون حاضر ہے جس میں اُنہوں نے حضرت مولٰنا تھانوی کے متعلق اپنے تأثرات بیان کئے ہیں، مضمون علمی اور تحقیقی نہیں ہے مگر بزرگانِ دین کا ذکر بھی دینی اور علمی فائدے سے خالی نہیں ہوتا۔"

(سیّد محمد ازہر شاہ قیصر)

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

بغیر مبالغہ کے یہ میں عرض کرتا ہوں کہ میں اکثر دفعہ بطور شکرانہ سربسجود ہوا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے مجھے یہ نعمت بخشی کہ میں نے حضرت اقدس حکیم الامّت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور محدّث دوراں، عالم باعمل، غزالیٔ وقت مولٰنا انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی زیارت کی اور ان دونوں قابل قدر ہستیوں کی مجالس میں مجھ سے ہیچمداں کو بیٹھنے کے قیمتی مواقع باری تعالیٰ نے بخشے۔ اس فرصت میں میں حضرت مولٰنا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔

میں اپنے آبائی وطن امرتسر شہر میں ۱۹۳۶ء و ۱۹۳۷ء میں طالب علمی کا زمانہ بسر کر رہا تھا۔ میری نشست و برخاست اکثر مولٰنا حبیب اللہ صاحب امرتسری مرحوم و مغفور سابق ہیڈ کلرک محکمہ انہار (ان کا انتقال ۱۹۵۰ء میں سرگودہا میں ہوا) اور محترم حکیم محمد علی صاحب امرتسری (حال گوجرانوالہ) کے ساتھ ہوتی تھی۔ وہیں سے حضرت مولٰنا تھانوی کی کچھ کتب و رسائل دیکھ کر تحقیق حق کا شوق پیدا ہوا۔ تحقیق حق کے الفاظ میں نے اس لئے استعمال کئے ہیں کہ میرے اکثر رشتہ دار مثلاً والد محترم خسر برادرانِ نسبتی وغیرہ علمائے دیوبند کے مسلک کے سخت خلاف تھے اور میرے عقائد بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ میرے اکثر رشتہ دار، تو تادم تحریر اپنے پرانے مسلک پر ہی چل رہے ہیں مگر اللہ تعالےٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے کم از کم ہم دونوں بھائیوں کے عقائد کو اِن بزرگوں کے قدموں کے طفیل حق پر ثابت قدم (باوجود مخالفت کے) رکھا۔ میرا اشارہ اپنے چھوٹے بھائی مولٰنا خالد محمود قریشی امرتسری ایم۔ اے کی طرف ہے جو سیالکوٹ کالج میں اسلامیات کے پروفیسر ہیں اور جن کے مضامین رسالہ ھذا میں بھی کبھی کبھی شائع

ہوتے رہتے ہیں۔

حضرت کی چند کُتب پڑھ کر احقر نے بُنیادی عقائد کے متعلق اپنے چند وساوس حضرت کی خدمت میں تھانہ بھون لکھ بھیجے۔ حضرت نے میرے خطوط واپس کر دیئے اور اُن کے حاشیہ پر میرے وساوس کا ایسا مدلل جواب لکھا کہ دل کو تسلی ہو گئی اور حضرت کی کرامت سے میرے عقائد کی مدلل اصلاح ہو گئی (افسوس کہ وہ خط و کتابت امرتسر میں ہی تقسیم ہند کے فسادات کے وقت نذرِ آتش ہو گئی، ورنہ ارادہ تو یہ تھا کہ کبھی اُسے شائع کرایا جائے گا) ابتدائی خط و کتابت کے بعد بھی چند وقفوں کے بعد مراسلت کا سلسلہ جاری رہا، اور بعد میں کئی دفعہ ارادہ ہوا کہ تھانہ بھون خود پہنچوں اور زیارت سے مشرف ہونے کی سعادت حاصل کروں مگر اس بات کی شرم مانع رہی کہ میری بدقسمتی سے میرا مغربی لباس اور ــــــ شباہت مجھے اُس مجلس کے قابل بھی رکھے گی یا نہیں؟۔

آخر کار ہمت کر کے احقر نے حضرت والا سے بذریعہ خط و کتابت بیعت کی درخواست کر ہی دی۔ حضرت نے اُس کے جواب میں مجھے تحریر فرمایا کہ پہلے رسالہ "قصد السبیل الی المولی الجلیل" پڑھو اور پھر بیعت کی درخواست کرو کیوں کہ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ تم نے یہ رسالہ تا حال نہیں پڑھا۔ فرمودہ کے مطابق احقر نے رسالہ قصد السبیل کو کئی بار پڑھا اور حضرت کی خدمت میں بیعت کی درخواست کی۔ اُس کے جواب میں حضرت نے چند سوالات اِسی رسالہ کے مفہوم کے متعلق تحریر فرمائے جو کہ مجھے اس وقت اگرچہ یاد تو نہیں رہے مگر اتنا یاد ہے کہ احقر حضرت اقدس کے اس امتحان میں بفضلِ تعالیٰ کامیاب ہوا۔ اور حضرت نے بکمالِ مہربانی احقر کی بیعت بذریعہ خط و کتابت قبول فرما لی ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہتِ گُل!
نسیمِ صبح تیری مہربانی!!!

اِس واقعہ کے چند ماہ بعد ہی راقم الحروف کو بصیغۂ ملازمت رائل انڈین نیوی بمبئی میں بطور اسٹینو گرافر جانا پڑا دیہ ملازمت میں نے تھوڑے عرصہ بعد ہی چھوڑ دی تھی اور پھر عثمانیہ ٹیکنیکل کالج حیدرآباد دکن میں ملازمت کا سلسلہ بطور پروفیسر شارٹ ہینڈ (مختصر نویسی) شروع ہو گیا تھا) اور دل یہ برداشت نہ کر سکا کہ امرتسر سے بمبئی یا حیدرآباد دکن جاتے وقت سہارنپور ریلوے اسٹیشن کو ویسے ہی چھوڑ جاؤں اور تھانہ بھون جا کر حضرت کا شرف قدمبوسی حاصل نہ کروں۔ اِس وقت تو میں یہ بھول چکا ہوں کہ میرا یہ سفر پہلا تھا، یا دوسرا؟ مگر بہرحال احقر نے حضرت کی خدمت میں حاضر ہونے کی ٹھان ہی لی اور چنانچہ اُس مجلس علم و عرفان میں احقر پہنچ ہی گیا۔ وہاں اور حضرات کے علاوہ اُس وقت خواجہ عزیز الحسن مجذوب ایم اے، ایل ایل بی سابق ڈپٹی کلکٹر میرٹھ (جو کہ بعد میں حضرت والا کے فرمان کے مطابق اپنی درخواست پر انسپکٹر آف اسکولز متعین ہو گئے تھے) بھی موجود تھے۔ خواجہ صاحب کو میں جانتا تھا، اور ایک دفعہ کسی دوست کی تقرری کے سلسلہ میں اُن سے واسطہ بھی پڑا تھا، اور خواجہ صاحب بھی مجھے جانتے تھے۔ یہاں چند سطور خواجہ صاحب کی ذات بابرکات کے متعلق لکھنا مضمون کو طول نہیں دیگا خواجہ صاحب مرحوم حضرت والا کے اُن سچے عاشقوں میں سے تھے جن کے متعلق شاعر نے یہ کہا ہے ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں۔ من دیگرم تو دیگری

خواجہ صاحب نے حضرت والا کی سوانح عمری "اشرف السوانح" تین حصّوں میں لکھی ہے جو اگرچہ آجکل پاکستان میں تو نہیں ملتی۔ مگر بھارت سے منگوائی جا سکتی ہے اور پڑھنے سے ہی تعلق رکھتی ہے۔ خواجہ صاحب موصوف پندرہ سال کے قریب یو، پی کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کلکٹر رہے اور پراونشل سول سروس کے سینئر آفیسر تھے۔ حضرت والا کی توجہ نے وہ اثر دکھایا ؎

ہر چہ بینم در جہاں غیر تو نیست
یا توئی یا خوئے تو یا بُوئے تو

حضرت والا پسند نہیں فرماتے تھے کہ خواجہ صاحب ایسی ملازمت پر متمکن رہیں جہاں کہ قریباً روزانہ خلاف شریعت فیصلے دینے پڑتے ہوں اور حضرت والا کے اظہارِ ناپسندیدگی کی یہی تھی کہ

ادھر خواجہ صاحب نے محکمہ سول سے محکمہ تعلیم میں تبادلہ کی درخواست دے دی، جو حضرت والا کی دعاء سے فوراً منظور ہوگئی۔ اور خواجہ صاحب اُسی تنخواہ پر ڈویژنل انسپکٹر مدارس متعین ہوگئے۔ احقر کو اِس وقت تک جن حضرات سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے (از متوسلین حضرت مولانا تھانوی علیہ الرحمۃ) اُن میں سے ان تین اصحاب میں بعینہٖ حضرت والا کا رنگ پایا۔ وہی طرزِ تکلم، وہی مجلسِ علم و عرفان، اور ان حضرات کے پاس بیٹھنے سے وہی دُنیا سے احساساتِ نفرت!!! میرا مطلب ان حضرات سے ہے (۱) مولانا مفتی محمد حسن صاحب خلیفہ حضرت مولانا تھانویؒ (۲) خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ اور (۳) مولانا سید سلیمان ندوی (جن کو اب مرحوم و مغفور لکھتے کلیجہ مُنہ کو آتا ہے) جن حضرات کو حضرت ندوی علیہ الرحمۃ سے اُن کے آخری سالوں میں مُلاقات کا موقع ملا ہے، اُنہوں نے دیکھا ہوگا کہ اُن پر بھی کس طرح حضرت والا کا رنگ غالب آگیا تھا، راقم الحروف کو کراچی میں اُن سے شرفِ نیاز حاصل ہوا تو مجھے فوراً تھانہ بھون یاد آگیا۔ اللہ اللہ!!! کیسی ہستی تھی حضرت مولانا تھانویؒ کی ذات بابرکات، اور کیسی کیسی ہستیاں اُن کی توجہ سے شمعِ ہدایت بنکر چمکیں۔ سلف کی یادگاروں میں سے پاکستان میں اِس وقت بہت تھوڑی ہستیاں رہ گئی ہیں۔ اللہ تعالےٰ مولانا مفتی محمد حسن صاحب خلیفہ حضرت تھانوی کا سایہ دیر تک ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ کیونکہ اب نیلا گنبد لاہور میں ہی تشنہ کام تسکین پاتے ہیں اور یہ شمعِ ہدایت اپنی ضیا پاشیوں میں مصروف ہے ؎

سالہا در کعبہ و بُتخانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

یا:-
سالہا باید کہ یک مردِ خدا پیدا شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن!

مولانا سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ کا انتقال حال ہی میں کراچی میں ہوا ہے۔ اُن کے وصال کی خبر پہونچنے پر لاہور کے اخبارات نے اپنے اتوار کے اڈیشن یا شیوع میں (۳ ۱۱/۵۳ کے شیوع۔ تاریخ ایک دن بعد کی ڈالی جاتی ہے) حضرت ندوی کی حیات پر مختلف مقالات لکھے مگر افسوس کہ جس شمعِ ہدایت کی ضیا پاشیوں کی بدولت حضرت ندویؒ نے روحانیت، تصوف و سلوک میں کمالات پیدا کئے اُس کا ذکر سوائے "نوائے وقت" لاہور کے (سوانح از مولانا حکیم رشید احمد ندوی) کسی اور اخبار نے نہیں کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا ندویؒ کے علمی اور ادبی کمالات میں مولانا شبلی نعمانی کا کافی ہاتھ تھا مگر رُوحانی مدارج اور کمالات تصوف و سلوک میں مولانا ندوی کا درجہ وہی شخص جان سکتا ہے، جس نے تقسیم ہند کے بعد مولانا ندوی کی مجلس میں شرکت کی ہو۔ حکیم رشید احمد ندوی لکھتے ہیں:-

"تصنیف و تحقیق اور علمی مسائل پر غور و فکر کے ساتھ ساتھ سید ندوی صاحب کی اصل افتادِ طبیعت بھی اپنا کام کرتی رہی یعنی وہ للہ و للہ ایثارِ نفس، خلوص فی الدین تزکیۂ نفس اور تصوف کی جانب مائل ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ دن آیا کہ اس فطری جوہر نے انھیں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بارگاہ میں لاکر کھڑا کردیا اور وہ مولانا تھانویؒ کے مُریدوں میں شامل ہوگئے اس ارادت کے بعد سید صاحب کی زندگی میں تصوف کا گہرا رنگ آیا اور وہ دنیا کی نمود و نمائش کی مکروہات اور حظِ نفس کی مقناطیسی قوتوں سے زیادہ سے زیادہ احتراز کرنے لگے۔"

میں کہاں سے کہاں چلا گیا؟ ذکر اس بات کا تھا کہ راقم الحروف آخرِ کار اُسی خانقاہ میں پہنچ گیا جس کا اپنے آپ کو سگِ درگاہ سمجھتا تھا اور اب بھی سمجھتا ہوں۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ اور حضرت والا کے بھانجے مولانا شبیر علی بھی وہاں بیٹھے تھے، میں اب ڈر کے مارے سوچ رہا تھا کہ بدقسمتی سے میرا مغربی لباس اور شباہت اور بعد میں تعارف حضرت والا کی ناراضگی کا موجب دو وجوہات سے ہوگا ایک تو یہ کہ میں باوجود خط و کتابت رکھنے کے بغیر اطلاع و اجازت آگیا، اور دوسرے جب وہ مجھے دیکھیں گے تو یہی خیال کریں گے

کہ اس نے دھوکہ سے بذریعہ خط و کتابت بیعت بھی قبول کروالی، اور اپنے ناپسندیدہ ماحول یعنی لباس، شکل و شباہت وغیرہ کا ذکر یا پتہ تک بھی نہ لگنے دیا۔ یعنی میری خط و کتابت سے تو ظاہر ہوتا تھا کہ لکھنے والا عربی اور فارسی کا عالم تو ضرور ہی ہوگا۔ مگر جب حضرت والا میرا غیر پسندیدہ لباس دیکھیں گے تو میری دھوکہ دہی پر کتنے ناراض ہوں گے؟ میں نے یہ بھی سُنا ہوا تھا کہ حضرت والا جب جلال میں آتے ہیں تو بہت ڈانٹ ڈپٹ بتلایا کرتے ہیں۔ میں اس بات کو سوچ سوچ کر پانی پانی ہوتا جارہا تھا اور رنگ فق تھا۔ خواجہ صاحبؒ میرا تعارف کرانے ہی لگے تھے کہ حضرت والا نے جھٹ فرمادیا "میں اس نوجوان کو جانتا ہوں، یہ امرتسر سے آیا ہے۔" میں اُس وقت سے لے کر آج تک اِس بات پر حیران ہوں کہ جب حضرت والا نے ایک دو دفعہ اپنے اوپر کشف کی نفی فرمائی ہے تو اُن کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ حاضرین مجلس تو یہی سمجھتے ہوں گے کہ پہلے سے ملنے والا ہوگا، یا ملاقات کے متعلق تحریری اجازت لی ہوگی، مگر حاشا وکلّا یہ میری پہلی حاضری تھی۔ میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ القاء تھا۔ اور حضرت والا کا ایک القاء ہی ہزاروں مکاشفات کے برابر تھا۔ لوگوں سے تو یہ سُنا تھا کہ حضرت والا بہت سخت طبیعت کے بزرگ ہیں۔ مگر میں نے حضرت کو ہمیشہ سراپا رحمت ہی دیکھا۔

اُسی مجلس میں حضرت والا دو باتوں کے متعلق فرمودات بیان کرتے رہے، ایک تو یہ فرمایا کہ "مجھے کسی انسان سے نفرت نہیں ہوتی بلکہ اُس کے فعل سے نفرت ہوتی ہے اور ناپسندیدگی اُس عمل کی ہوتی ہے۔" دوسرے آپ نے حقہ اور سگرٹ کی برائیوں کے متعلق مختصر سی گفتگو فرمائی۔ اُس وقت تک تو میں حقہ اور سگرٹ کا کثرت سے عادی تھا۔ مگر یقین جانیئے کہ حضرت والا کی اس کھلی کرامت کے سبب جب میں اُس مجلس سے رخصت ہوا، تو تمباکو سے اتنی نفرت پیدا ہوگئی کہ بعد میں کبھی بھی دل نہیں چاہا۔ اور آج تک تمباکو سے نفرت اُسی طرح چلی آرہی ہے۔ یہ تھا حضرت اقدس کی مختصر سی توجہ اور فرمودات کا فوری اثر! سبحان اللہ! ؎

قال را بگذار مرد حال شو ٭ پیش مرد کاملے پامال شو

کشف کے متعلق تو کئی احباب نے مجھ سے ذکر کیا کہ حضرت والا نے اغلباً اپنے لئے دُعا کر رکھی ہے کہ انھیں کشف نہ ہوں جیسا کہ کئی بزرگوں نے باریتعالے سے یہی دُعا کی تھی۔ مگر جیسا کہ پہلے بیان کرچکا ہوں حضرت والا کے القاء مکاشفات سے بھی اعلیٰ ہوتے تھے۔

اِس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد راقم الحروف نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کی ملازمت چند وجوہ کی بناء پر چھوڑ دی۔ اگرچہ خانصاحب شیخ اللہ رکھا ڈپٹی انسپکٹر مدارس (جو کہ حضرت والا کے شیدائیوں میں سے تھے اور جن کا انتقال گذشتہ سال لاہور میں ہوا) نے مجھے بہتیرا منع کیا۔ مگر حالات ہی کچھ ایسے ہو چکے تھے کہ طوعاً و کرہاً حیدرآباد دکن کو خیرباد کہنا پڑا، اور احقر اپنے وطن واپس آگیا۔

امرتسر میں فروکش ہوکر راقم الحروف پنجاب میں ہی کسی قسم کی ملازمت کی کوشش کررہا تھا اور ملازمت کے چھوڑنے کے علاوہ قلق اس بات کا بھی تھا کہ دورانِ سفر میں حضرت والا کی زیارت کا موقع تو مل ہی جایا کرتا تھا۔ اِنہی خیالات میں راقم الحروف غرق رہتا تھا کہ اچانک امرتسر میں ہی سُنا کہ حضرت والا لاہور یا امرتسر تشریف لارہے ہیں۔ بس احقر کی خوشی کا تو کچھ نہ پوچھیئے کیونکہ راقم الحروف پیشتر ہی اِسی تگ و دو میں تھا کہ کب حضرت والا کی زیارت کروں۔ حضرت شیخ المشائخ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر ہے۔ ؎

ملنے نہ ملنے کا تو وہ مختار آپ ہے
پر تجھ کو چاہیئے کہ تگ و دو لگی رہے

یہاں حضرت حاجی صاحبؒ کا تذکرہ آجانے سے فضاء معطر ہوگئی!!! سبحان اللہ۔ حضرت اقدس مولانا تھانوی رح کے شیخ بھی کیسے شیخ تھے جو کہ شیخ العرب والعجم تھے۔ حضرت حاجی صاحب رح بھی اُسی سلسلے کی مجاہد ہستیوں میں سے ایک مجاہد تھے جس سلسلہ میں حضرت سید احمد بریلوی، حضرت مولانا اسمٰعیل شہید اور حاجی صاحب کے مرید حضرت شیخ الہند مولانا

(دوسری قسط)

حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

(احسان الحق قریشی سیالکوٹ)

حضرت والا ۱۹۳۶ء میں لاہور تشریف لانے والے تھے سفر کا سلسلہ تو حضرت نے عرصۂ دراز سے ترک کر دیا تھا مگر سالہا سال کے بعد حضرت نے اب سفر کا ارادہ فرمایا تھا۔

آپ کو لاہور میں ڈاکٹر جلال الدین صاحب ماہر امراض دندان سے دانتوں کے سلسلے میں کچھ مشورہ لینا تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف حضرت کے سچے عاشقوں میں سے ہیں اور انہی کے بار بار عرض کرنے پر حضرت نے سفر کا ارادہ فرمایا تھا۔ اس سفر کی روئیداد ایک کتابچہ کی شکل میں بھی صفحۂ قرطاس پر آچکی ہے۔ جس دن حضرت مولانا لاہور سے امرتسر ڈاکٹر صاحب کی کار میں تشریف لائے وہ دن مجھے تا عمر نہیں بھولے گا۔ ۱۹۳۸ء کی گرمیوں کے دن تھے۔ حضرت کو اپنے ایک عاشق صادق مفتی محمد حسن صاحب مدظلہ العالی کے دولت خانے پر قیام کرنا تھا مفتی صاحب کے صاحب زادے مولانا عبید اللہ صاحب (جو کہ جوانی میں بھی "در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری" کے مصداق ہیں) اور راقم الحروف دونوں انتظام میں مصروف تھے۔ خلقت تھی کہ حضرت کی تشریف آوری کی خبر سنکر امنڈی چلی آتی تھی۔ کیا موافق اور کیا مخالف دونوں طرح کے اصحاب جمع ہو گئے تھے۔ حضرت گرانڈ ٹرنک روڈ شریف پورہ (امرتسر) پر کار سے اترے۔ اور اصحاب کے ساتھ احقر کو بھی شرف مصافحہ بخشا۔ مجھے اس وقت تک حضرت کا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پہچاننے کی کامیاب کوشش کرنا بخوبی یاد ہے اور وہ وقت یاد کر کے آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں ع "بسیار خوبان دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری"

اس دن میں تو اور اصحاب کے ساتھ انتظام میں مصروف رہا اور ادھر مجلس علم و عرفان گرم رہی۔ مفتی صاحب کا روئے مبارک خوشی سے چمک رہا تھا۔ ع

"عالم میں تم سے لاکھ سہی، تم مگر کہاں!!!"

اس دن حضرت کی مجلس میں مزاح ذرا غالب رہا۔ کبھی کبھی راقم الحروف بھی انتظام سے فارغ ہو کر ایک آدھ فرمودہ سن ہی لیتا تھا۔ حضرت ایک واقعہ پر ایک لطیفہ کو منطبق فرما رہے تھے۔ واقعہ تو ذہن سے فراموش ہو گیا ہے مگر لطیفہ یاد رہا۔ فرمانے لگے کہ "آقا نے ملازم کو صراحی لانے کے لئے کہا۔ ملازم صراحی کو گردن سے پکڑ کر لایا۔ آقا نے کہا کہ جس وقت صراحی منگوائی جائے تو دوسرا ہاتھ پیٹ پر بھی رکھ کر لایا کرو۔ کچھ دیر بعد پھر صراحی منگوائی گئی، تو ملازم نے اسی طرح صراحی کی گردن پکڑی ہوئی تھی مگر ہاتھ بجائے صراحی کے پیٹ کے اپنے پیٹ پر رکھا ہوا تھا!!!" اگر مجھے وہ واقعہ بھی اس وقت یاد آجاتا، جس پر حضرت نے یہ لطیفہ منطبق فرمایا تو قارئین بھی یقیناً محظوظ ہوتے۔

عصر کی نماز حضرت نے مسجد نور میں پڑھائی۔ راقم الحروف بھی پہلی صف میں تھا۔ حضرت نے باآواز بلند فرمایا کہ "میں مسافر ہوں، دو رکعت پڑھوں گا، آپ اپنی نماز پوری کر لیں۔" چنانچہ اسی طرح ہوا۔ بعد میں حضرت نے مولانا نور احمد صاحب رح کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ مولانا مرحوم کے صاحبزادگان مولانا محمد داؤد مرحوم اور مولانا محمد سلیمان بی، اے بھی موجود تھے۔ اس کے بعد حضرت کار میں ہی بازار مہان سنگھ کٹڑہ میں

تشریف لے گئے جہاں اُن کے ایک مُرید باصفا حکیم محمد علی صاحب کا مکان تھا۔ حضرت کے تشریف لیجانے کے بعد چند مخالفین احقر سے بحث کرنے لگے کہ حضرت نے امامت فرماتے وقت عصر کے صرف دو فرض کیوں بحیثیت مسافر پڑھے، امامت کے وقت نماز پُوری پڑھانی لازمی تھی؟ دوسرے مولانا نور احمد صاحب کے مزار پر فاتحہ خوانی کے وقت حضرت والا نے ہاتھ کیوں نہ اُٹھائے، بغیر ہاتھ اُٹھائے کیوں فاتحہ پڑھی؟ میں کوئی عالم تو تھا ہی نہیں جو اِن باتوں کا جواب دیتا۔ صرف عالموں کی جوتیاں سیدھی کرنیوالا تھا۔ احقر نے حضرت مفتی صاحب سے مدلّل جوابات دریافت کر کے مخالفین کی تسلی کر دی۔

بعد کی کسی ملاقات میں مولانا محمد داؤد مرحوم نے مجھ سے پوچھا کہ وہ مجھے حضرت کی مجلس میں اُس دن دیکھ کر حیران ہو گئے تھے، میں نے وجہ پوچھی تو فرمانے لگے کہ "اس سے پہلے اُنہوں نے احقر کو حضرت پیر جماعت علی شاہ صاحب ثانی رح کی مجلس میں بھی دیکھا تھا۔"

راقم الحروف یہاں عرض کرتا ہے کہ علی پور سیداں ضلع سیالکوٹ میں دو حضرات ایک ہی نام کے تھے۔ اُن میں سے زیادہ مشہور حافظ جماعت علی شاہ صاحب تھے (جن کا انتقال گذشتہ سال ہی ہوا ہے) حافظ صاحب مرحوم اکابر دیوبند کے سلک کے سخت خلاف تھے اور سخت ترین الفاظ استعمال کیا کرتے تھے، مگر دوسرے جن کو پیر جماعت علی شاہ صاحب ثانی کہا جاتا تھا فقیر منش درویش تھے اور نسبتاً کم معروف تھے۔ ایک ہی قصبہ کے ہمنام بزرگوں میں زیادہ مشہور حافظ جماعت علی شاہ ہی تھے۔ ثانی صاحب کا انتقال ۱۹۳۹ء میں ہوا تھا، اور حافظ صاحب کا ۱۹۵۱ء میں۔ ثانی صاحب رح نے کبھی بھی اکابر دیوبند کو بُرا بھلا نہیں کہا، بلکہ وہ اکثر مولانا نور احمد امرتسری کے پاس تشریف لایا کرتے تھے۔ احقر کی اہلیہ شروع ہی سے اُن کی مرید تھیں، اور میں بھی کبھی کبھار ثانی صاحب رح کی مجلس میں جا بیٹھا کرتا تھا۔ میں نے مولانا محمد داؤد کو جواب دیا کہ یہی سوال آپ اپنے سے بھی دریافت کیجئے۔ آپ بھی ثانی صاحب رح کی مجلس میں گئے اور حضرت والا کی مجلس میں بھی۔ اگر آپ اِس فعل کو تضاد سمجھتے ہیں تو آپ نے بھی ایسا ہی کیا تھا؟ مرحوم فرمانے لگے کہ "چند مسایل میں ان بزرگوں کا اختلاف تھا اِس لئے میں نے یہ سوال دریافت کیا۔" میں نے عرض کی، چند فروعی مسائل میں تو حضرت حاجی صاحب رح کا اختلاف حضرت تھانوی رح سے تھا اور حضرت حاجی صاحب رح نے اِس اختلاف کی اجازت بھی دے رکھی تھی۔ نیز اختلاف تو حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کا اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رض سے بھی تھا، تو کیا ان دونوں قسم کے فرمودات سُننے والے کو آپ الزام دیں گے؟" میرے اِس جواب پر مرحوم فرمانے لگے کہ "تم نے دُرست کہا۔" اور اُن کی تسلی ہو گئی۔

۱۹ر اور ۲۰ر جولائی ۱۹۴۳ء (۱۵ر اور ۱۶ر رجب ۱۳۶۲ھ) کی درمیانی شب اپنے وطن اور اپنے شیخ حضرت حاجی صاحب رح کے وطن تھانہ بھون میں ۸۳ سال کی عمر میں واصل بحق ہوئے

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ؂

سالہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

حضرت والا کی تعلیمات، ارشادات، تصوّف و سلوک، فقہ و تفسیر، حدیث و سنت وغیرہ کے متعلق تفصیل سے کچھ معلوم کرنا ہو تو مولانا عبدالماجد دریا بادی مدیر "صدق" لکھنؤ کی تازہ تصنیف "حکیم الامت" (قیمت آٹھ روپے، دار المصنفین اعظم گڈھ، یو، پی۔ بھارت) پڑھی جائے، یا پروفیسر عبدالباری کی تصنیف "جامع المجدّدین" اور "تصوّف و سلوک" جامع اشرفیہ نیلا گنبد، لاہور سے منگوائی جاوے۔

راقم الحروف مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی تصنیف "حکیم الامت" کے کچھ اقتباسات ذیل میں درج کرتا ہے جن میں مولانا نے حضرت کے متعلق کچھ تاثرات بیان کئے ہیں:۔

مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی بھی حضرت والا کے خلفاء[عہ] میں سے ہیں، اور ان کے اخبار "صدق" لکھنؤ کا نام انکو

عہ مولانا عبدالماجد، حضرت مولانا تھانوی رح سے نہ مجاز بالبیعت ہیں اور نہ مجاز با صحبت، خاتمۃ السوانح مصنفہ خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب کے آخر میں مولانا تھانوی رح کے خلفاء کی جو فہرست درج ہے اس میں بھی مولانا عبدالماجد کا نام نہیں۔ اور حاشیہ ص م

عہ مولانا عبدالماجد نے بیعت حضرت مولانا مدنی مدظلہ سے کی اور اپنا تعلق حضرت مولانا تھانوی رح سے رکھا۔ (قیصر)

محتاج تعارف نہیں رہنے دیتا۔

مولانا دریاآبادی کا مکتوب خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوبؔ کے نام

کرم گستر۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ! کیا عرض کیا جائے کن الفاظ میں عرض کیا جائے کہ سانحۂ عظمیٰ کی خبر سُن کر دل پر کیا گذر رہی۔ دل پر میرے ہی نہیں بلکہ میرے گھر بھر کے، بیوی کے بچوں کے۔ تعزیت کروں تو کس سے کہ میں خود ہی مستحقِ تعزیت ہوں انا للہ وانا الیہ راجعون۔ عالمِ اسلامی میں اِس سے بڑھ کر قیامت خیز حادثہ اس وقت اور کیا ہو سکتا ہے۔ دُنیائے اسلام میں سناٹا ہو گیا۔ وقت کا سب سے بڑا عالم، سب سے بڑا عارف محمدؐ کی فوج کا سب سے بڑا کارگزار اور وفادار جنرل، رفیقِ اعلیٰ سے جاملا۔ ہم بدبخت ایسی نعمت کے اہل ہی کب تھے؟ حیرت اس پر نہیں کہ یہ نعمتِ عظمیٰ اپنے وقت پر واپس لے لی گئی، حیرت تو یہ ہے کہ یہ نعمتِ عظمیٰ اتنے دنوں ہم میں رہی کیسے؟ ع

"تو بہارِ عالم دیگری زکجا بہ ایں چمن آمدی!"

مزارِ اشرف پر حاضری کی تمنّا دل میں عرصہ سے تھی، جولائی کے مہینے سے یہ قرض برابر چلا آرہا تھا۔ نوبت وسط نومبر ۱۹۴۳ء میں آئی، ۱۵ر کی دوپہر سے قبل تھانہ بھون اسٹیشن پر اُترا اور سیدھا مزار پر حاضر ہو گیا۔ تھانہ بھون کی حاضری خدا جانے کتنی بار ہو چکی تھی۔ آج کا سفر ان سارے سفروں سے کتنا مختلف تھا! کیسا قوی اور کامل یقین کہ دوکان کُھلی ہوئی ہے، مطب گرم ہے، جاتے اور پہنچتے ہی مرہمِ شفا ہاتھ میں ہوگا، ہر درد کی دوا، ہر فکر و غم سے تشفّی۔ مگر آج رُت بدلی ہوئی تھی، آج قسمت پلٹی ہوئی تھی۔ دوکان بند، مطب اُجاڑ۔ شفا، کی بجائے حسرتِ شفا، دوا کی جگہ دوا کی یاد۔ مکین کے عوض صرف مکان۔

اسٹیشن سے مزار کا فاصلہ ہی کتنا؟ پورے دو فرلانگ بھی نہیں۔ اور مزار۔ نہ کوئی بلند گنبد نہ کوئی کلس اور قبہ، نہ چاردیواری نہ آستانہ، نہ جنگلہ نہ کٹہرا، ایک اوسط درجہ کی وسعت کا باغ، وسطِ باغ میں چند گز مربع کا ایک مسطح تختہ اور وہی اللہ کے اس شیر کی خواب گاہ، نہ شامیانہ نہ چھت، صرف آسمان کی کُھلی ہوئی چھت کے نیچے ایک نیچی سی کچی تُربت، سادگی کی تصویر، صاحبِ قبر کی بے نفسی کا آئینہ!!! نہ لوح نہ کتبہ۔ نہ پھول نہ چادر۔ چند قدم کے فاصلے پر وصل بلگرامی، اور دوسرے مخلصین کی قبریں تھیں۔ شیخ کی قبر ان سب قبروں سے بھی پست، زندگی میں بھی تو اپنے کو اپنے متوسلین سے پیچھے رکھتے تھے۔ تصوّر کی آنکھ نے کیا کیا دیکھا تخیل کے کان میں کیا کیا آوازیں آئیں، کوئی کہے بھی تو کس زبان میں کہے ع

"ایں حدیثے را بیانِ دیگر است"

جی میں آیا کہ مٹی اٹھا کر آنکھوں سے لگا لیجئے۔ عقل نے کچھ اور ہی سمجھایا۔ روتی ہوئی آنکھ اور روتے ہوئے دل کے ساتھ سلامِ رخصت عرض کیا، اور اپنے کو خانقاہ امدادیہ تک پہنچایا خانقاہ! آہ رُوحِ بے جسد، وہ مکانِ بے مکین، وہ انگشتریٔ بے نگین! مدرسہ چل رہا تھا لیکن سہ دری خاموش، ویران، بجھی ہوئی شمع، ایک ہُو کا عالم سناٹے کا مقام۔ نہ دری نہ جاجم، نہ تکیہ نہ مسند، نہ ڈسک نہ قلمدان۔ یاد ایک ایک چیز کی آتی رہی، اور دل کو حسرت و عبرت کی ختم نہ ہونے والی داستان سُناتی رہی۔ یُوں آنا ہوتا تھا، یہاں بیٹھنا ہوتا تھا۔

آہ! تو کیا تیرا یہ بندہ بھی فانی تھا؟ بے شک موت و فنا تو اِس نامور خادم (حکیم الامت تھانویؒ) کے نامور آقا (محمدؐ) تک کے لئے مقدر کر دی گئی تھی۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔ یہ ایک آیت اُمت کی تسلی و تعزیت کی کیسی، پُوری دُنیا کی دُنیا اپنے اندر آباد رکھتی ہے۔

اپنی زندگی میں اللہ والے متعدد دیکھ ڈالے، بڑے بڑے عابد۔ متقی، تہجد گذار نظر سے گذرے، لیکن اصلاح و ارشاد کی مسند نشینی کا حقدار جیسا حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کو پایا کسی اور کو نہ پایا کتنے ہی بزرگ صورت درویش نما عالم لباس، خرقہ پوش۔ عمامہ بند، ایسے ملے جن کی حقیقت چند مہینوں یا برسوں کے سابقہ کے بعد مخفی نہ رہ سکی۔ حضرت کے ہاں تو نظر سے زندگی بن گئی، بے معنی

زندگی بامقصد ہوگئی۔ ورنہ خدا معلوم مقسوم کہاں کہاں مارا مارا بھٹکاتا پھراتا رہتا۔ حضرت کا اختلاف بھی دوسروں کے اتفاق سے بڑھکر نفع بخش و ہدایت آموز ہوتا تھا۔ اور جب خواجہ عزیزالحسن مجذوب نے درِ اشرفی سے ناکام جانے والوں کے حق میں کہا کہ:۔ ع

"میخانے کا محروم بھی محروم نہیں ہے"

توشاعری نہیں کی صرف واقعہ بیان کر دیا۔

بلاکسی استحقاق اور جہد وطلب کے یہ نعمت جاں نواز کچھ کم شامل حال رہی کہ اتنے ہی دن کی خدمت وصحبت نصیب ہوگئی یہ اور بات ہے کہ سکندر آبِ حیواں تک رسائی پا جانے کے بعد بھی پیاسے کا پیاسا واپس ہوا۔

حضرت کی سوانح نگاری کا حق اور لوگ ادا کرینگے۔ حضرت کی مجددانہ مصلحانہ وحکیمانہ تعلیم وتربیت پر بھی وہ لوگ لکھیں گے جو اس کے اہل ہیں۔ اِن صفحات میں تو اس نامہ سیاہ نے صرف وہی لکھا ہے جو کچھ اپنے تجربہ میں براہ راست آیا۔ عارف رومی رح کی زبان میں ع

"اے تو افلاطون وجالینوس ما"

یا خسرو دھلوی رح ؎

"صد ہزاراں عید قربانت کنم
اے ھلالِ ما خم ابروئے تو!"

اب راقم الحروف اپنی عرض کرتا ہے۔ حضرت کے خلفاء تو بے شمار ہیں۔ چند خلفاء مثلاً مولٰنا سید سلیمان ندوی رح، خواجہ عزیزالحسن مجذوب رح۔ اور مولٰنا عبدالماجد دریاآبادی کے تذکرے اوپر ہو چکے۔ مگر حضرت کے خلیفہ مولٰنا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری کا تذکرہ ابھی بہت باقی ہے۔ حضرت والا کے وصال کے وقت احقر ملتان میں تھا، اور وصال کی خبر کے بعد طبیعت کچھ کھوئی کھوئی سی رہتی تھی۔ رنج والم کے جذبات غالب تھے۔ احقر چھٹیوں میں اپنے وطن امرتسر آیا۔ بعد میں تبادلہ بھی امرتسر ہی ہوگیا۔ ایک رات اِرادہ کیا کہ مفتی صاحب کے پاس جاکر درخواست تجدید بیعت کروں۔ صبح حاضر ہونے کے اِرادے سے احقر سوگیا۔ رات کو کیا دیکھتا ہوں کہ پہلے تو خانہ کعبہ میں فرائضِ حج ادا کر رہا ہوں، اُس کے بعد مفتی صاحب نے مجھے بیعت کرلیا (اور سامنے حضرت والا بھی بیٹھے ہیں) صبح میں نے اِس اِشارے پر عمل کرتے ہوئے تجدید کا اِرادہ چھوڑ دیا۔ اور مفتی صاحب کو بطور جانشینِ حضرت والا ہی سمجھتا رہا، اور ملتا رہا اور تاحال ملتا ہوں۔

گذشتہ سال (ماہ مارچ ۱۹۵۲ء) مفتی صاحب لاہور سے سیالکوٹ برائے علاج تشریف فرما ہوئے۔ ہم لوگوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ روزانہ بعد نماز عصر مجلس علم وعرفان گرم ہوتی اور مجھے تو مفتی صاحب میں حضرت والا کی صورت ہی دکھلائی دیتی۔ حضرت مفتی صاحب کے ارشادات اور فرمودات وہ مزہ دیتے کہ ؎

چوں چتر سنجری رُخ بختم سیاہ باد
در دل اگر بود ہوس چتر سنجرم
زانکہ کہ یافتم خبر از ملکِ نیم شب
من ملکِ نیم روز بیک جو نمی خرم

جیسا پہلے عرض کر چکا ہوں احقر کے والدِ محترم، ہمارے (یعنی احقر کے برادرِ خورد پروفیسر خالد محمود ایم اے کے) مسلک کو کچھ پسند نہیں فرماتے تھے۔

حضرت مفتی صاحب کا قیام سیالکوٹ قریب اختتام نظر آرہا تھا، کیوں کہ حضرت کو جامعہ اشرفیہ لاہور سے بار بار عرضداشتیں موصول ہو رہی تھیں کہ حضرت جلد واپس تشریف فرما ہوں۔ اِدھر احقر العباد دست بدعا تھا کہ آپ کا قیام اور لمبا ہو جائے۔

ایک دن احقر نے قبلہ والد صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ نے اکابرِ دیوبند میں سے کسی بزرگ کو آجتک نہیں دیکھا، صرف ہماری خاطر مفتی صاحب کی زیارت کرلیں۔ والد صاحب قبلہ بھی بڑھاپے کی وجہ سے کبھی سیالکوٹ سے باہر نہیں جایا کرتے اور اپنی ملازمت کے دوران میں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس رہے (آجکل پنشنر ہیں) میں نے بار بار مجبور کیا کہ آپ صرف دو منٹ ہماری خاطر حضرت کی زیارت سے مستفید ہوں اور بعد میں

خواہ اپنی رائے پر قائم رہیں یا بدل لیں ؎

آج کا دن ہے دل کھول کے مل لیں ان سے
پھر خدا جانے کہ یہ ساماں رہے یا نہ رہے!!

والد صاحب قبلہ نے فرمایا کہ "میں اکیلا ہی جاؤں گا، تم ساتھ مت جانا اور صبح کو جاؤں گا، شام کو نہیں جاؤں گا"۔ چنانچہ والد صاحب مفتی صاحب سے ملے۔ والد صاحب کے بیان کے مطابق مفتی صاحب فراست سے سمجھ گئے کہ یہ وہی ہیں جن کا تذکرہ کبھی کبھی راقم الحروف آپ سے کیا کرتا ہے۔

اِتَّقُوْا مِنْ فِرَاسَۃِ الْمُؤْمِنِ "مومن کی فراست سے ڈرو،
فَاِنَّہٗ یَنْظُرُ مِنْ نُوْرِ اللّٰہِ۔ کیونکہ وہ اللہ کے نور کے ذریعہ
(حدیث پاک) اوکما قال۔ سے دیکھتا ہے"

والد صاحب فرماتے ہیں کہ مفتی صاحب کی یہ کرامت تھی کہ جو بات میرے دل میں آتی تھی، آپ اُسی کے متعلق گفتگو شروع کر دیتے تھے۔ والد صاحب جب واپس لوٹے تو کافی بدلے ہوئے تھے ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

جس دن مفتی صاحب واپس تشریف لیجانے والے تھے اُس سے ایک دو دن پہلے چند احباب نے بیعت کی درخواست کی (اور احقر نے بھی تجدید بیعت کی درخواست کی) آپ نے واپسی کے دن صبح کا وقت بعد نماز فجر دیا (غالباً اتوار کا روز تھا) شومیٔ قسمت سے ایک دن پہلے احقر کو پسرور سے ایک دوست کا تار آگیا جس میں ایک نہایت ضروری کام کی وجہ سے وہاں پہنچنا لازمی تھا ورنہ اُس کی ملازمت کو سخت خطرہ تھا۔ طوعاً و کرہاً چار و ناچار مجھے پسرور جانا پڑا۔ دوسری صبح میرے احباب مثلاً قاضی محمد دین صاحب اورنٹیل ٹیچر، چوہدری غلام احمد صاحب انکم ٹیکس آفیسر، خان اورنگ زیب خاں صاحب بلنگ کلرک وغیرہ بیعت ہو گئے۔ احقر اُسی شام واپس آیا تو قافلہ جا چکا تھا۔ اُسی کمرے کو جا کر پھر دیکھا۔ زبان سے نکلا۔

ع "ایں قدح بشکست و آں ساقی نماند"

اُس رات احقر کا حال کیا رہا وہ نہ پوچھیے، غمگین، پریشان حال آنکھیں اشکبار سو رہا۔ بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ رات کو پھر مفتی صاحب سے ملاقی ہوا اور حضرت نے پھر بیعت فرمایا۔ سامنے حضرت مولانا رحمہ اللہ بھی تشریف فرما نظر آئے۔ چنانچہ صبح صبح خوش و خرم اٹھا، اور غم و اندوہ کو بھلا دیا۔ اب جب تیسری بار تجدید بیعت کا ارادہ کروں گا تو خدا جانے کیا صورت پیش آئے۔ بقول مجذوب ع

"میخانے کا محروم بھی محروم نہیں ہے"

مفتی صاحب کی ذات بابرکات کے متعلق احقر الانام کے ان سطور کے تحریر کرنے کا مقصد صرف یہی ہے کہ حضرت حکیم الامت کے متوسل خاص کی شان اُجاگر ہو کر قارئین کرام کو حضرت والا کے مدارج کا اندازہ لگانے میں مدد ملے۔ ورنہ حکیم الامت کس مرتبہ اور پایہ کے ولی اللہ تھے، اس کا حال تو وہی بتا سکتا ہے، جو خود بھی بزرگ، عارف اور ولی اللہ ہو۔ احقر الانام تو کسی بزرگ کی جوتیاں سیدھی کرنے کے قابل بھی نہیں۔ مفتی صاحب کا ذکر کرنے سے صرف مولانا تھانویؒ کا مرتبہ بتلانا مقصود تھا۔

ع "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب"

ورنہ میں کیا اور میری لکھنے کی بساط ہی کیا؟ حضرتؒ کے مریدین و مسترشدین میں بڑے بڑے پایہ کے لوگ گزر چکے ہیں، اور ماشاء اللہ اب بھی سلامت باکرامت ہیں۔ اُن میں سے کئی حضرتؒ کی سوانح نگاری کا حق ادا کر چکے ہیں، اور بعض حضرتؒ کی تعلیمات کی بہترین شرح و ترجمانی کر رہے ہیں ورنہ اپنے متعلق تو ؎

کہاں میں اور کہاں وہ نکہتِ گل!
نسیم صبح تیری مہربانی

آئندہ مضمون میں انشاء اللہ تعالیٰ شیخ الحدیث حضرت اقدس مولانا سید انور شاہ صاحبؒ کی ذات بابرکات کے متعلق اور اُن کے سفر امرتسر و بھاولپور کے متعلق معلومات ہوں گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ +